باسمہٖ

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ طلوعِ اسلام ۱۲

شاہ ولی اللہؒ اور قرآن وحدیث

شائع کردہ

ناظمِ ادارۂ طلوعِ اسلام

قرول باغ - دہلی

مطبوعہ جیدبرقی پریس - دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین میں قرآن، احادیث۔ فقہ۔ اجماع۔ قیاس وغیرہ کی حیثیت اور ان کا باہمی ربط کیا ہے؟ یہ وہ اہم سوال ہے جس کے صحیح جواب پر دین کی صحت کا دار و مدار ہے۔ جب تک ان چیزوں کی صحیح صحیح حیثیت متعین نہیں ہوتی دین کے معاملہ میں آپ افراط و تفریط سے نہیں بچ سکتے۔ اور چونکہ ایک مسلمان کے لئے "دین" زندگی کا سب سے اہم سوال ہے اس لئے اس کے لئے ان مسائل پر غور کرکے ایک محکم نتیجہ پر پہنچنا نہایت ضروری ہے۔ طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر زندگی کا یہ اہم ترین گوشہ ہے اور اس کی دعوت ان مسائل پر غور و فکر کی دعوت ہے۔ یہ راہ کتنی پرخطر اور یہ وادی کس قدر خارزار ہے ہمیں پہلے دن سے اس کا احساس تھا۔ صدیوں سے معطل ذہنوں کو جھنجھوڑ کر ان میں حرکت پیدا کرنا۔ مدتوں کے غلط معتقدات کو اسلام کی صحیح تعلیم سے بدلنا۔ یہ کچھ آسان مرحلہ نہ تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہماری مخالفت میں کیا کیا حربے استعمال کئے جائیں گے۔ یہ احساس یقیناً ہمت شکن تھا۔ لیکن دوسری طرف قرآن کریم کی آواز اس شدت اور قوت سے اظہارِ حق کی تاکید کر رہی تھی کہ اس کے سامنے مخالفتوں کا ہجوم اور مشکلات کا ازدحام کچھ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ للہ الحمد کہ محض اس کی توفیق کے صدقے ہم اتنی قلیل سی مدت میں فضا میں اچھی خاصی تبدیلی محسوس کر رہے ہیں۔

اسی موضوع پر علامہ عبید اللہ صاحب سندھی کے مقالہ کے بعض حصص مربوط شکل میں آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا بغور مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ جناب سندھی کے الفاظ اپنے ہیں۔ لیکن تعلیم و حکمت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کی ہے۔ اس لئے کہ خود ان کا ارشاد ہے:-

"میں معانی کو شاہ صاحب کی حکمت سے باہر نہیں جانے دیتا۔ عام مفسرین سے جہاں کہیں اختلاف کروں گا وہ شاہ صاحب کے اصول سے تشبث کے تحت میں ہوگا۔ بعض ایسے مواقع بھی ملیں گے کہ میری سند مولانا شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین اور مولٰنا محمد اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد قاسم کے کلام میں ملے گی۔ شاذ و نادر ایسی باتیں ہونگی جو خود میرے فکر کا نتیجہ ہیں۔ میں ایسے مواقع پر صراحۃً بتا دیا کرتا ہوں کہ یہ میری سوچی ہوئی بات ہے۔ اس کا رد و قبول ہر وقت سامع کے اختیار میں ہے۔" (الفرقان ص۲۶۳)

یہ مضمون طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اب بغرض افادۂ عام ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)
شمیم منزل۔ رشیدی پورہ۔ گلی ڈوری والان۔ دہلی

شاہ ولی اللہؒ اور قرآن و حدیث

جب کوئی قوم اپنے مرکز سے ہٹ جاتی ہے تو چونکہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند مقصد نہیں رہتا اس لئے رفتہ رفتہ اس کے فکر و عمل کی قوتیں مضمحل ہوتی چلی جاتی ہیں اور بالآخر ان پر جمود و تعطل (مسکنت) کا عذاب اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں حرکت باقی نہیں رہتی سہل انگاری کی زندگی ان کی فطرت ہو جاتی ہے نہ ذہن میں سوچنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے نہ دل میں کوئی ولولہ۔ نہ بازوؤں میں قوتِ عمل ہوتی ہے نہ پاؤں میں چلنے کی ہمت۔ اس سہل انگاری اور آرام پسندی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس ڈگر پر چلتے آرہے تھے اسی پر چلے جارہے ہیں۔ قرآن کریم نے امم سابقہ کے احوال و کوائف سے بار بار اس طرف توجہ منعطف کرائی ہے کہ حق کی دعوت کو سب سے پہلے ہمیشہ ان لوگوں نے ٹھکرایا جن میں آرام طلبی اور سہل انگاری پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ ہمیں سوچنے سمجھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہمارے آباء و اجداد جس روش پر چلے آرہے تھے وہی روش ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔ اب اس میں تبدیلی پیدا کرنا گویا راہ راست سے ہٹکر گمرہی اختیار کرنا ہے، حالانکہ ان کا تجزیہ نفس کیا جائے تو یہ حقیقت فوراً سامنے آجائے کہ وہ آباء و اجداد کی روش سے اسلئے نہیں ہٹنا چاہتے تھے کہ ان میں جمود و تعطل آچکا تھا۔ وہ اس قدر آرام طلب ہو چکے تھے کہ جہاں بیٹھ گئے تھے وہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا اسی سہل انگاری کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے "حصول نجات" کے لئے بھی بڑی بڑی آسان راہیں وضع کر رکھی تھیں۔ ذرا غور فرمائیے۔ اگر ایک شخص یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ اپنے مکان کے ایک گوشے میں نرم و نازک قالین کے مصلے پر بیٹھ کر۔ (سردیوں کے موسم میں) نہایت نفیس و لطیف شال اوڑھے ادھر ادھر تکئے لگائے آتشدان میں آگ سلگائے اور آگ میں لوبان چھڑکائے تسبیح کے دانوں پر چند الفاظ دہرا لینے سے سیدھا جنّت میں پہنچ سکتا ہے۔ تو وہ بھلا ایسے شخص کی آواز پر کیسے کان دھر سکتا ہے جو یہ کہے کہ جنت کا راستہ یہ نہیں جنت کی راہ اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے بیوی بچے۔ گھر بار یہ تمام عیش و عشرت کے سامان چھوڑ کر۔ کوہ و دشت و بیاباں میں سر بکف پھرنا۔ بھوک اور پیاس کی مشقتیں برداشت کرنا اور پھر عند الضرورت جان جیسی متاعِ عزیز قربان کر دینا ہے۔ یہ مثال جسمانی سہل انگاری کی ہے۔ اسی طرح ذہنی سہل انگاری کی

کیفیت ہے۔ جو یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ علم کی تکمیل ان چند کتابوں کے ازبر کر لینے میں ہے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے اسلاف نے لکھدی ہیں اور ان پر کسی قسم کا اضافہ یا تنقید گناہِ عظیم ہے وہ اس شخص کی کیوں سنے جس کی پکار یہ ہو کہ صحیح علم اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانے سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے لئے عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی ضروری ہے اس کی ذہنی سہل انگاری اسے اس طرف آنے کی اجازت ہی نہ دے گی۔ لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کریگا کہ وہ سہل انگاری اور آرام طلبی کی وجہ سے اس طرف نہیں آتا۔ نفس انسانی بڑا حیلہ تراش واقعہ ہوا ہے۔ وہ یہ کہکر فریب دے گا کہ نہیں! حق کی راہ وہی ہے جس پر میں چل رہا ہوں اور اس کی سند یہ ہے کہ میں نے اپنے آباو اجداد کو اسی راہ پر چلتے دیکھا ہے۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۵/۱۰۴

(خواہ ان کے آبار و اجداد کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور وہ راہ راست پر بھی نہ ہوں)

مسلمانوں پر ایک عرصہ سے یہی جمود و تعطل مسلط ہے جس نے ان کے افکار و اعمال کی قوتوں کو یکسر بیکار کر رکھا ہے۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ انھیں ان کے مرکز کی طرف دعوت دیتا ہے تو ان کے اربابِ سیادت اس سے گھبرا اٹھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے تاکہ ان کی نیند میں فرق نہ آنے پائے۔ پھر یہ لوگ اپنی ذہنی سہل انگاری کی وجہ سے دعوت دینے والے کے دعوے کا جواب بھی دلیل و حجت سے نہیں دیتے بلکہ اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس پر ایک ایسا لیبل چسپاں کر دیا جائے جس سے عوام مشتعل ہو جائیں، اور یوں اسے نکو بنا دیا جائے۔ اگلے دنوں ہمارے ایک دوست نے اسی قسم کے "لیبل" کی ایک بڑی دلچسپ بات سنائی آج سے کچھ عرصہ پہلے جب جماعتِ اہل حدیث نے جہالت و توہم پرستی کی رسوماتِ قبیحہ کے خلاف آواز بلند کی تھی تو ان کے لئے "وہابی" کا لیبل وضع کیا گیا تھا اور عوام میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت "وہابی" ہوتا ہے۔ سرحد کے ایک گاؤں میں ایک ہندو دوکاندار تھا۔ ایک دفعہ مولوی صاحب اس سے کسی بات پر بگڑ بیٹھے اور اسے چیلنج دیدیا کہ دیکھ! میں تجھے کس طرح سیدھا کرتا ہوں جمعہ کی نماز میں مولوی صاحب نے اعلان کر دیا کہ یہ دوکاندار "وہابی" ہو گیا ہے اس لئے اس سے کوئی مسلمان خرید و فروخت نہ کرے۔ بس پھر کیا تھا۔ چار ہی روز میں لالہ جی کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور اس نے مولوی صاحب کو راضی کر لیا۔ دوسرے جمعہ میں مولوی صاحب نے اعلان کر دیا کہ اب خیر فضل ہے لالہ پھر دیوان (ہندو) ہو گیا ہے "وہابی" نہیں رہا۔ اب اس کا بائیکاٹ ختم ہو گیا۔ یہ ہے لیبل کا اثر۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں اس قسم کے لیبل وضع ہوتے چلے آئے ہیں آج اسی قسم کا ایک لیبل "منکرِ حدیث" کا ہے۔ اور

ہمارا خیال ہے کہ علم النفس کی رُو سے اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس لیبل کے وضع کرنے میں اس جذبۂ انتقام کا بھی بڑا ہاتھ دکھائی دے گا "جُو وہابی" کے لیبل سے اس سے پیشتر پیدا ہو چکا تھا) اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ میں قرآن کریم کو دین کی مکمل کتاب مانتا ہوں یعنی میرا ایمان ہے کہ یہ صحیفۂ مقدس تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے نجات و سعادت کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ اسی کتابِ عظیم پر حضور سرورِ کائنات (صلعم) نے عمل کیا اور اسی کے مطابق اس حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہوا جس میں اللہ کے یہ قوانین، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے عملاً نافذ ہوئے۔ تو چونکہ یہ آواز قوت و عمل کی طرف دعوت دینے والی آواز ہے۔ اس لئے سہل انگاری اور آرام طلبی نے فطرتی طور پر اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور اپنی عادت مستمرہ کے مطابق دلائل و براہین کے بجائے لیبل تراشی سے کام لیا۔ چنانچہ اس کے لئے "منکرِ حدیث" کا لیبل وضع کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا فلیتہ چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد خود پھر اسی میٹھی نیند میں سو گئے جس میں مدتوں سے سوتے چلے آرہے تھے۔ اس قسم کی "لیبل تراشی" جہاں ایک طرف ان لوگوں کے آرام و سکون (یعنی جمود و تعطل) میں خلل اندازی کے فتنے سے انھیں کچھ وقت کے لئے محفوظ کر دیتی ہے۔ دوسری طرف بہت سے بے علم مدعیانِ علم و دین کی جہالت کے لئے عارضی نقاب پوشی کا بھی کام دیتی ہے۔ کس قدر آسان ہے یہ کہدینا کہ یہ آواز اس لئے حق کی آواز نہیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس کے خلاف ہے!

طلوع اسلام، مسلمانوں کو انسانوں کے بنائے ہوئے دین سے ہٹا کر اس دین کی طرف دعوت دینے کا مدعی ہے جو اللہ نے انسانوں کے لئے بنایا اور نبی اکرمؐ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچا۔ چونکہ یہ آواز مدتوں کے آرام طلب اور سہل انگار مسلمان کی نیند میں خلل اندازی کا موجب تھی۔ اسلئے اس پر بھی ایک لیبل لگ جانا ضروری تھا۔ وہی لیبل جو آج کل "منکرِ حدیث" کے نام سے معروف ہے۔ اربابِ سیادت نے یہ لیبل لگایا اور پھر اپنی گہری نیند میں سو گئے اور عوام سے کہہ گئے کہ ہاں! ذرا ہوشیار رہنا۔ اس لیبل والا مسلمان بڑا خطرناک قسم کا ڈاکو ہوتا ہے۔ وہ تمہارے متاعِ ایمان و عقیدت کو جھپٹ کرلے جائے گا۔ اس کے قریب نہ پھٹکنا۔ ان اشتعال دلانے والوں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو دل میں اپنے مسلک کی کمزوری کو جانتے ہیں لیکن بعض وجوہ کی بناء پر اس کا علانیہ اعتراف نہیں کر سکتے۔ کچھ حسد و عداوت کی بناء پر۔ کچھ عوام کی طرف سے جھوٹی عزت کی خاطر بعض اپنی سیادت کی سند کو قائم رکھنے کے لئے۔ اور بعض معاش کی مجبوریوں کی وجہ سے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ بالکل نئی نئی باتیں ہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف میں تو کسی کے ہاں اس قسم کی باتیں دیکھی نہیں! حالانکہ اگر یہ لوگ کبھی غور و فکر کی ہمت کرتے تو ہو سکتا تھا کہ خود اسلاف میں بھی اس قسم کی باتیں مل جاتیں۔ اس لئے کہ انہی میں سے جنھوں نے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔ انھیں ایسی باتیں مل ہی گئیں۔ اسی قسم کی ایک مثال ہم آج پیش کر رہے ہیں دنیائے مذہب میں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں نہ ہی جناب عبیداللہ صاحب سندھی کا نام نامی۔ اوّل الذکر متقدمین میں اور ثانی الذکر متاخرین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جناب سندھی۔ حکمتِ ولی اللّٰہی کے بہت بڑے مفکر اور مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے شاہ ولی اللہؒ کے متعلق ایک بسیط مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا جو رسالہ الفرقان کے "ولی اللہ نمبر" میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ قرآن۔ حدیث فقہ وغیرہ کے متعلق شاہ صاحبؒ کے اہم خیالات پر مشتمل ہے۔ ہم اس مقالہ سے جستہ جستہ مقامات نقل کرتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ ان اصولی مباحث میں حضرت شاہ صاحبؒ اور جناب سندھی کا مسلک کیا ہے۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم ان حضرات کے خیالات کو بطور سند پیش نہیں کر رہے اسلاف اور اپنے ہم عصر حضرات کی پوری تعظیم و تکریم کے جذبات کے ساتھ ساتھ ہم اس حقیقت کا بھی اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک دین کے معاملہ میں کسی انسان کی رائے یا عقیدہ حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جو رائے یا عقیدہ قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہ قابل قبول ہوگا۔ ورنہ ہم کہدیں گے کہ ان حضرات نے غلط سمجھا۔ اسی اصول کا ہم اپنے اوپر بھی اطلاق کرتے ہیں۔ ہماری جو بات کتاب اللہ کے خلاف ہو اسے آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی درخور اعتنار تصور نہ فرمائیے۔

جناب سندھی نے محولہ صدر مقالہ مختلف صحبتوں میں املا فرمایا اور ایک دوسرے صاحب نے اسے قلمبند کیا تھا۔ بنا بریں مقالہ میں خاص طور پر ربط قائم نہیں رہ سکا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اقتباسات میں ربط ملحوظ رکھا جائے۔ نیز بعض مقامات پر تھوڑی بہت تشریح کی بھی ضرورت محسوس کی گئی ہے جناب سندھی کے مقالہ کے اقتباسات واوین ("......") میں درج کئے گئے ہیں۔ واوین سے باہر کی عبارت ہماری اپنی ہے۔ آپ ان اقتباسات کا غور و تعمق سے مطالعہ فرمائیے اور استیعاب کے لئے اصل مقالہ کی طرف رجوع کیجئے۔ واللہ المستعان۔

۱۔ فقہ اور قرآن

جناب سندھی فرماتے ہیں :۔

"فقہائے عظام نے قرآن عظیم کو اپنی اصولِ فقہ میں پہلے درجہ پر رکھا ہے مگر اس سے مراد ان کے یہاں چند آیات احکام ہیں جو اوامر و نواہی کی شکل میں قرآن حکیم میں مدوّن ہیں۔ اس تخصیص کا یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک عالم سارا قرآن سمجھنا ضروری نہیں جانتا۔ پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی تفسیر واعظوں اور قصہ گو، افسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ آگئی اور فقہاء کا اس میں دخل نہ رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن لوگوں نے یہ خیال بنایا تھا کہ فقیہ بننے کے لئے قرآن کریم کے فقط اوامر و نواہی کافی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ قرآن کو مس تک نہیں کر سکے۔ جب مسلمانوں کی مرکزی جماعت کا قرآن عظیم کے متعلق یہ خیال ہو تو عوام بیچارے اس بارے میں کہاں تک قابلِ ملامت قرار دئے جا سکتے ہیں" (ص۲۴۳ و ص۲۴۶)

یہ ان فقہا کی کیفیت تھی جنھوں نے فقہ کی تدوین کی۔ بعد میں آنے والے حضرات نے قرآن کریم کی طرف اتنا سا رجوع بھی ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک دین۔ تمام و کمال۔ فقہ کے اندر آچکا تھا جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل جائز نہ تھا۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اور سب کچھ پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن قرآن پڑھانے کی ضرورت بالکل نہیں سمجھی جاتی۔ قرآن کی تلاوت محض ثواب کی خاطر رہ گئی ہے۔

۲۔ شانِ نزول

جناب سندھی فرماتے ہیں :۔

"ائمہ فقہا نے اپنے اصول میں بالاتفاق یہ مسئلہ درج کیا ہے کہ اگر قرآن شریف میں ایک آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کا کوئی خاص واقعہ سبب بتاتے ہوں تو قرآن فہمی میں عموم الفاظ ہی مدنظر رہے گا۔ خصوصیتِ محل کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔ اس قاعدے پر اتفاق کرتے ہوئے آپ جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیں گے ہر آیت کے الحت ایک جزئی واقعہ پائیں گے۔ مثلاً یہ آیت ابوجہل کے حق میں ہے۔ یہ عبداللہ بن ابی منافق کے بارہ میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق کی فضیلت میں اتری۔ اس میں اہلِ بیت کے فضائل کا بیان ہے۔ عام اساتذہ اور طلبہ کو آپ انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے۔ شاہ صاحبؒ نے "الفوز الکبیر" کی ابتداء میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے اور آیات احکام کا مطلب یہ بتلایا کہ اجتماعی طور پر انسانوں میں جو بداخلاقیاں اور بداعمالیاں موجود ہیں ان کو ان آیات کا سبب نزول سمجھنا چاہئے۔ عرب۔ یا عجم زمانے کے تقدم یا تاخر سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔" (ص۲۴۳)

یہ اس لئے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک احول۔ ایک زمان یا ایک مکان کے لئے نہیں بلکہ ہر

ماحول، ہر زمان - اور ہر مکان کے لئے ہے - اور کسی شانِ نزول - موقعِ نزول یا واقعہ نزول کا پابند نہیں - وہ قیامت تک کے لئے دینی نصاب ہے اور ہر زمانہ میں اس سے نئی روشنی نکالی جا سکتی ہے - اس لئے فہمِ قرآن کو کسی ایک زمانہ سے وابستہ کر دینا بھی درست نہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جناب پرویز کی معرکتہ الآرا کتاب "معارف القرآن" کا بصیرت افروز مقدمہ - از علامہ اسلم جیراجپوری)

۳- عقل اور قرآن

جناب سندھی فرماتے ہیں :-

"عام مفسرین نے روح کے علم کو متشابہات میں داخل کر رکھا ہے - کوئی مفکر اس کے قریب نہیں جا سکتا اس لئے تمام مسائلِ بعد الموت - تحت اللفظ ترجمہ پڑھنے سے زیادہ قابلِ غور نہیں سمجھے جاتے - یہاں تک کہ عقائد کی کتابوں میں توحید اور نبوت کا مسئلہ تو عقلی مانا جاتا ہے اور عذاب القبر سے لیکر آگے کی تمام بحثیں نقلی سمجھی جاتی ہیں - عذاب القبر کو صرف اس لئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے - شاہ صاحبؒ نے اپنی تالیفات میں مسلمانوں کو اس غلطی سے بچایا ہے - ما بعد الموت جو زندگی قرآن ثابت کرتا ہے ان کے یہاں مسلسل عقلی نتائج کا مجمل بیان ہے - عقل صریح کی پوری تائید کے بغیر کوئی چیز قرآن منوانے کی خواہش نہیں رکھتا" (ص ۴۶-۴۵)

ہم اس مقام پر روح کے مسئلہ میں الجھے بغیر اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم اپنے آپ کو نور کہتا ہے جو خود بھی روشن ہوتا ہے اور اپنے ارد گرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے - وہ عقل کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے دعاوی بصیرت پر مبنی ہیں اس لئے جہالت اور توہم پرستی کا اس میں کوئی دخل نہیں - وہ سراپا حکمت ہے اور ہر صاحبِ بصیرت کو تفکر و تدبر کی بار بار دعوت دیتا ہے اس لئے جوں جوں انسانی علم و عقل ترقی کرتے جائیں گے - قرآنی غوامض بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مقدمہ" جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے)

جناب سندھی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "عذاب القبر کو صرف اس لئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے - یہ بالکل درست ہے - قرآن کریم میں عذاب قبر کا کہیں ذکر نہیں - (اس کی تفصیل کے لئے علامہ اسلم جیراجپوری کی بصیرت افروز کتاب "تعلیمات قرآن" ملاحظہ فرمائیے -)

۴- متشابہات

جناب سندھی ارشاد فرماتے ہیں :-

"قرآن حکیم نے آیات قرآنی کی تقسیم محکمات اور متشابہات میں کردی ہے۔ عموماً اہل علم متشابہات میں بحث کرنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ پھر متشابہات کی ایسی واضح تعریف و تفسیر جس سے تمام ایسی آیتیں تحقیقی اور تحدیدی طور سے جدا کرلی جاسکیں۔ کوئی متفق علیہ موجود نہیں ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک تو قرآن تمام ناقابلِ فہم ہوگیا اور متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ مقرر ہوگیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ بن جائے کہ اس کے بعض حصے (جس کا پورا تعین بھی نہیں) فہم سے بالاتر ہیں تو انسانی متوسط عقول کے لئے ساری کتاب مشتبہ بن جاتی ہے طبیعت میں خدشات اور اوہام اٹھتے ہیں کہ فلاں فلاں آیت کا جو مفہوم ہم نے معین کیا ممکن ہے کہ اس کی نقیض ان آیات میں موجود ہو جن کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس غلط فکر نے عمل کے لئے قرآن کی طرف سے مسلمانوں کے التفات کو یکسر ہٹا دیا.......... جو لوگ ان اصطلاحات کے پابند ہیں جن سے ان مسائل (تقدیر وغیرہ) پر غور کرنا کسی راسخ فی العلم کے لئے بھی جائز نہیں ہوسکتا (اور ان ہی سے مدارس و کاتب بھرے پڑے ہیں) میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس زمانہ میں اسلام کے لئے کس قدر مفید ہوسکتے ہیں" (صہ ۲۵ و صہ ۲۵۵)

صرف متشابہات ہی نہیں۔ بلکہ یہاں تو یہ حالت ہے کہ سارے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ پچھلی تفاسیر میں آچکا ہے۔ اس میں مزید تدبر و تفکر گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ ناسخ و منسوخ جناب سندھی کا ارشاد ہے۔

"قرآن عظیم میں فکری انتشار کا ایک اور باعث مسئلہ ناسخ و منسوخ کی بحث بھی ہے۔ اہلِ علم منسوخ آیات کو متفقہ طور پر محدود و محصور نہیں کرتے۔ یعنی ایسی آیات کی تحدید میں وہ خود باہم مختلف ہیں۔ اس کا اثر قرآن کریم پڑھنے والے پر یہ پڑتا ہے کہ وہ ہر عملی معاملہ (حکم) میں اس کے منسوخ ہونے کا شبہ پیدا کرکے اپنے آپ کو فارغ الذمہ بنا لیتا ہے.......... شاہ صاحبؒ اس اصطلاح پر قرآن میں منسوخ نہیں مانتے۔ لیکن واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ کا بیان اس فصل میں حکیمانہ ہے قوم کی عام حالت کو مدِنظر رکھ کر انھوں نے اس مسئلہ کو تدریجاً سمجھانے کی سعی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے اہلِ علم پانچسو آیتیں منسوخ مانتے رہے لیکن شیخ جلال الدین سیوطی اتقان میں بیس سے زیادہ آیتیں منسوخ تسلیم نہیں کرتے.......... شاہ صاحبؒ مذکورۂ بالا بیس آیتوں میں بھی تطبیق دیکر نسخ کو پانچ آیتوں میں منحصر کردیتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ جس شخص نے ان پندرہ آیتوں کی تطبیق غور سے پڑھی وہ باقی ماندہ پانچ آیتوں میں بھی بآسانی تطبیق

دے سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ صراحتہً یہ نہیں کہتے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت منسوخ نہیں اور وہ اس طرح صراحتہً لکھتے تو بعض معتزلہ کے قول سے تشابہ ہو جاتا اور عام اہلِ علم اس پر غور کرنا ہی چھوڑ دیتے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مشکل آیتوں کو تو انھوں نے حل کر دیا اور نہایت آسان آیات میں نسخ مان لیا۔ اگر اسلوبِ حکیمانہ پر ان کے بیان کو حمل کیا جائے تو ہمارا مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کرنا بعید نہ ہوگا" (صفحہ ۵۶-۲۵۵)

قرآن کریم میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جس بناء پر صراحتہً ایسا نہیں لکھا۔ وہ دوسرے الفاظ میں وہی ہے جسے ہم نے شروع میں "لیل" سے تعبیر کیا ہے (ناسخ و منسوخ کی بحث کے لئے معارف القرآن کا محولہ صدر "مقدمہ" ملاحظہ فرمائیے)

۶۔ تفاسیرِ قرآن

جناب سندھی مختلف (مشہور و معروف) تفاسیر کے تذکرہ کے بعد فرماتے ہیں کہ

"ان سے ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق سوائے تحیر کے کچھ نصیب نہیں ہوا .... ہم مانتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں مسلمانوں نے انہی کتابوں سے قرآن سمجھا تھا جب وہ قرآن کی حکومت مجتہدانہ طور پر قائم کر رہے تھے مگر اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ہمارے لئے ناممکن ہے" (صفحہ ۲۴۷) اس سے آگے حاشیہ میں مذکور ہے "دورِ حاضر کے طلباء اور علماء کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ کتاب الٰہی کی تعلیم کے وقت متن کو چھوڑ کر شروح (تفاسیر) پر زور دیتے ہیں۔ اور فن حدیث میں صحاح کی شرح حجۃ اللہ البالغہ سے پوری پوری غفلت برت کر صرف متون پر اکتفا کرنا شعار بنا لیا گیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں غیر طبعی ہیں" (صفحہ ۲۵۰)

قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس کے لئے کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں۔ ہماری تفاسیر دراصل قرآن فہمی کی تاریخ ہیں۔ یعنی ان سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں فلاں دور میں قرآن کریم کس طرح سمجھا گیا۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن ہی سے ہو سکے گی۔ یہی وہ اصول ہے جس پر جناب پرویز نے اپنی کتاب معارف القرآن کو ترتیب دیا ہے جو قرآن کو قرآن ہی کے رنگ میں پیش کرتی ہے تفاسیر کے متعلق تفصیلی معلومات اس کتاب کے محققانہ مقدمہ سے مل سکیں گی۔

۷۔ مکمل کتاب

جناب سندھی رقمطراز ہیں۔

"اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے متنِ قرآن کی حقیقت اپنے اشراق سے اس طرح معین

کرلی کہ یہ کتاب بذاتِ خود ایک کامل مکمل نصاب ہے اس پر اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں" (صفحہ ۲۴۹)

یہ ہے وہ سب سے بڑا الزام جو ہمارے خلاف عائد کیا جاتا ہے یعنی ہم قرآن کریم کو مکمل کتاب کیوں مانتے ہیں اور اس میں کسی اضافہ کی ضرورت کیوں نہیں سمجھتے! ہمارا دعوےٰ یہ ہے کہ دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے۔ قرآن رسول اللہؐ کی وساطت سے اُمت کو ملا۔ یہ حضورؐ کا منصب رسالت تھا۔ قرآن کا منشا یہ ہے کہ زمین پر خدا کی حکومت قائم ہو۔ یعنی قرآن کا قانون دنیا میں عملی طور پر نافذ ہو۔ امت تک قرآن پہنچانے کے ساتھ ساتھ حضورؐ پر حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا فریضہ بھی عائد ہوا۔ اور یہ ایک بالکل فطری شئے تھی۔ قرآن کاغذوں میں لکھے جانے اور زبان سے دہرائے جانے کے لئے نہیں نازل ہوا تھا بلکہ دنیا میں ایک نیا (لیکن فطرتِ انسانی کے مطابق) نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے نازل ہوا تھا۔ یہ نظامِ زندگی سب سے پہلے حضورؐ کے عہدِ سعادت مہد میں قائم ہوا۔ اور خلافت راشدہ تک جاری رہا اس میں قرآنِ کریم قانون اساسی تھا۔ کوئی چیز اس سے باہر نہ تھی اسی کی روشنی میں جزئی معاملات کے لئے فرعی قوانین مرتب ہوتے تھے اس کے بعد یہ سلسلہ گم ہو گیا اب (بتوفیق ایزدی) جس وقت پھر وہی نظام قائم ہو گا۔ اس میں قرآن قانون اساسی کی حیثیت رکھے گا اور دورِ اولےٰ کے فرعی قوانین۔ نئے نئے مباحث و معاملات کے تصفیہ کے لئے قوانین مرتب کرنے میں ممد و معاون ثابت ہونگے۔ یہ ہے دین کی عملی شکل۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اس باب میں جناب سندھی کا کیا ارشاد ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

۸۔ قرآن و سنت و اجماع

"عام اہلِ علم قرآن شریف کے ساتھ سنت اور اجماع کو اولہٰ شرعیہ (یعنی دینی حجت۔ طلوعِ اسلام) میں شمار کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب سنت کو قرآن سے مستنبط چیز مانتے ہیں۔ لیکن اس استنباط کا طریقہ وہ نہیں ہے جو ائمہ فقہا میں مروج ہے۔ بلکہ حکمت کے اصول پر استنباط کرنے کے طریقے اور ان کے اصول شاہ صاحب کے یہاں علیحدہ مقرر ہیں خیر کثیر میں اس مسئلہ کی انھوں نے تفصیل لکھدی ہے اس طرح پر اگر سنت کو مانا جائے تو قرآن کے استقلال پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔[1] رسول اللہ (صلعم) کے عہد سے خلافتِ راشدہ کے آخری وقت تک یعنی

---

[1] یعنی قرآنِ کریم میں حکم موجود ہو۔ اور رسول اللہ نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہو۔ اس طرح دین کا مستقل نصاب قرآن کریم ہی رہیگا۔ طلوعِ اسلام

شہادت حضرت عثمانؓ (۳۵ھ) تک شاہ صاحبؒ کی تحقیق میں، مسلمانوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ اس دور کو وہ دور اجماع کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل ازالۃ الخفا میں مذکور ہے شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد اختلاف شروع ہوا۔ اب اجماع وہی مستند ہوگا جو مذکورہ دور اول کے تتبع ؎ میں منعقد ہو۔ شاہ صاحبؒ اس دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل ازالۃ الخفا میں موجود ہے۔ اسے ساری دنیا جانتی ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا مستند سوائے قرآن عظیم کے کوئی لکھی ہوئی چیز نہ تھی۔ اس پر یہ جماعت اپنے پارٹی پالیٹکس کے نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عمل کرتی تھی۔ اس پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی طرف اشارہ ہے قرآن حکیم کی ذیل کی آیت میں۔ السّابقون الاوّلون من المہاجرین والانصار، والذین اتّبعوھم باحسان رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ رسول اللہؐ کی صحبت اور تعلیم سے جو جماعت قرآن پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوئی۔ اس کا وہ مرکزی حصہ جس کا ہر قول وفعل خدائے تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ وہ مہاجرین اور انصار کا پہلا طبقہ تھا۔ اس کی اتباع قران پر عمل کرنے کے لئے قیامت تک مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ (یعنی قرآن کے اصولوں میں نہ کہ فرعی قوانین میں جس کے متعلق خود جناب سندھی نے اگلی سطروں میں فرمایا ہے کہ وہ ہر زمانہ میں قابلِ تغیر ہو سکتے ہیں۔ طلوع اسلام) جو چیز اس زمانہ میں متعین ہوگئی۔ اس کو اس شکل میں اور اسی معنی میں قائم رکھنا اتباع بالاحسان ہے۔ (اسی شکل سے مراد غالباً نماز۔ روزہ وغیرہ کی شکلیں ہیں جسے ہم عمل متواتر یا تعامل سے تعبیر کرتے ہیں۔ ورنہ فرعی معاملات کی شکلیں تو ہر زمانہ میں بدلتی رہیں گی۔ طلوع اسلام) زمانے کے تغیرات سے جو نئی چیز قابلِ بحث پیش آئے وہاں اس جماعتِ متبعین بالاحسان کا فیصلہ ماننا ضروری ہوگا (یعنی حکومت الٰہیہ قائم کرنے والی جماعت کی سنٹرل کمیٹی۔ طلوع اسلام) یہ اس دور کے مابعد کے اجماع کا حاصل ہے۔ اس طرح اجماع قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے متفقہ فیصلے یا اغلبیت کے فیصلوں کا نام ہوگا۔ لہذا اجماع قرآن سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ اجماعیات، قرآنی اصول کے تشریحی بائیلاز ہونگے۔ اس سے کوئی ترقی کن جماعت۔ جو زمانہ کے طویل عرصہ میں کام کرے۔ خالی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اجماع کبھی قرآن کے مقابل ایک مستقل اصل نہ بنا بلکہ قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے اتفاق کا نام ہوا۔ اس طور سے مسلمانوں میں قرآن کے

؎ یعنی حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو اور اس میں مسلمانوں کی مرکزی جماعت متفقہ طور پر یا اکثریت سے کسی فیصلے پر پہنچے۔

(طلوع اسلام)

مستقل درجہ کا تعارف کرانے والی شخصیت امام ولی اللہ دہلوی ہیں"۔ (ص۲۶۳-۲۶۲)

اسی چیز کو جناب سندھی نے حاشیہ میں اور بھی واضح فرما دیا ہے۔ اقتباس سے پیشتر (عام قارئین کے سمجھنے کے لئے) ایک بات تمہیداً لکھ دینا ضروری ہے۔ متشدد فی الحدیث طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا وہ وحی (یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ) ہے اس کا ایک حصہ قرآن ہے۔ اور دوسرا حصہ احادیث۔ اس کی سند میں وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ "وَمَا ينطق عَنِ الْهَوىٰ ان هُوَ الا وحیٌ یوحیٰ" (یعنی یہ رسول اپنی ذاتی خواہش سے کچھ نہیں کہتا بلکہ یہ تو وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے) حالانکہ اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ قرآن ایک وحی ہے جو حضور پر نازل کی گئی ہے۔ حضور اسے اپنی طرف سے وضع کر کے (معاذ اللہ) پیش نہیں کر رہے۔ اس کے بعد جناب سندھی کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"علمائے اصولِ فقہ لکھتے ہیں کہ اصولِ دین چار ہیں۔ کتاب و سنت و اجماع و قیاس۔ درحقیقت یہ تعبیر صحیح نہیں۔ کیونکہ قیاس تو وہی معتبر ہے جو اصول ثلاثہ سے مستنبط ہو۔ باقی رہے تین اصول۔ سو ہمیں بڑی محنت کے بعد معلوم ہوا کہ ساری سنت قرآن سے مستنبط ہے۔ خیر کثیر ص۸۷ میں اس کی تصریح موجود ہے (یعنی قرآن سے باہر سنت کہیں نہیں ہے۔ طلوعِ اسلام) پھر آنحضرت صلعم اور خلفاء ثلاثہ کے متفقہ فیصلہ کے بغیر کوئی عمل مستند نہیں ہے (یعنی اس دور میں اجماع انہی کے متفقہ فیصلوں کے نام تھا۔ طلوعِ اسلام) کیونکہ حضرت علیؓ کے عہد میں خیر الامم سے مشورہ کا جوہر کھو گیا تھا۔ لہٰذا اجماع کا مدار بھی کتاب و سنت پر ہوا۔ بنا بریں اصل ہے فقط کتاب اللہ۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ، ای ما ینطق بالقُرآنِ عَنِ الْهَوىٰ ہمارا رسولؐ دین کے معاملہ میں کوئی ہوائی کی بات نہیں کہتا۔ ذاتی خواہش کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ اور دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے۔ یہاں ما ینطق سے مطلق نطق (یعنی رسول اللہ کی ہر ایک بات۔ طلوعِ اسلام) مراد رکھ کر وحی متلو اور غیر متلو کو ملا دیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں یہ پسندیدہ نہیں۔ بلکہ مطلق نطق بالقرآن (یعنی قرآن کی بات۔ طلوعِ اسلام) مراد ہے"۔

اوپر کی عبارت چونکہ زیادہ واضح نہیں اس لئے اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ جناب سندھی کے نزدیک (یعنی شاہ صاحبؒ کی تعلیم کے مطابق) قرنِ اولےٰ کے مسلمانوں کے فیصلے (سنت) ناقابل تغیر ہیں اور انھیں اسی شکل میں قائم رکھنا اور اسی طرح ان کی اتباع کرنا ضروری ہے۔ ذیل کی تشریح میں جناب

سندھی نے اپنے مفہوم کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمادیا ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلعم اور آپ کے بعد خلفاء ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ خلافت عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں۔ ...... سنت کو ہمارے فقہاء حنفیہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے۔ اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے ...... اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائیلاز اُس وقت اور تھے اِس وقت اور ہونگے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہونگی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا۔ اور اس کا نام فقہ ہے" (صـ۲۶۴)

یعنی رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین نے حکومت الٰہیہ کے قیام میں باہمی مشاورت سے قرآن کریم کی روشنی میں جو تمہیدی قوانین (بائیلاز) مرتب فرمائے ان کا نام سنت ہے۔ یعنی اُس زمانہ کی فقہ۔ یہ بائیلاز ہر زمانہ میں بدلتے رہیں گے۔ لیکن اصل قانون (قرآن کریم) اپنی جگہ پر قانون اساسی کی حیثیت سے مستقل رہے گا۔

۹۔ قرآن اور حدیث

جناب سندھی کی مذکورہ صدر تصریحات کے بعد حدیث کی حیثیت واضح ہوجاتی ہے لیکن طریقہ جمع و تالیف کی رو سے احادیث کے مجموعوں کی کیا حیثیت ہے! اس کے متعلق وہ مزید وضاحت فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

"سورۂ النجم کی آیت ان ھو الا وحی یوحیٰ کی دو طرح تفسیر کی جاتی ہے۔

(۱) شاہ صاحبؒ کے طریقے پر تحقیق یہ ہے کہ ضمیر ھو قرآن کی طرف راجع ہے۔ اور مَا ینطقُ عَنِ الھویٰ میں بھی نقلِ قرآنی کے متعلق بحث ہے۔

(۲) مگر اہل علم کی دوسری جماعت اس آیت کو قرآن سے مخصوص نہیں مانتی اور رسول اللہ صلعم کے تمام تر اقوال کو ایک طرح کی وحی ثابت کرنے پر زور دیتی ہے۔ ان کے نزدیک وَمَا یَنطِقُ عَنِ الھَویٰ

قرآنی نقل سے مقید نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلعم کا ہر قول وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی میں داخل ہے اور اسی کو اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) ان حضرات کے نزدیک حدیث کی اصل بھی وحی ہی سے ثابت ہے نفقط الفاظ کا فرق ہے۔ قرآنی الفاظ وحی سے معین ہوئے اور حدیث کے الفاظ رسول اللہ صلعم کے اپنے طبعی ملکہ سے صادر ہوئے ہیں مگر معنی سب کے سب وحی ہیں۔

(۲) پھر ان کے نزدیک یہ فرق بھی موجود ہے کہ قرآن خود رسول اللہ صلعم کے سامنے ایک مصحف میں کتابتہ محفوظ کر دیا گیا اور اس کی روایت بالتواتر قائم رہی لیکن حدیث میں جو وحی آئی ان کے نزدیک بھی نہ تو حضورؐ کے زمانہ میں اس کی کتابت ہوئی اور نہ اس کے لئے تواتر ضروری ہے۔

ان لوگوں کی اصطلاح پر اگر کتب مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کا درجہ دیا جائے تو بطریق اولےٰ اس کو مستبعد نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو تسلیم کر لیں تو تمام اشکال حل ہو جائیں (۱) ہماری کتب حدیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں۔ (۲) نیز ان کتب حدیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ (۳) ہماری بہت سی کتب حدیث میں کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علماء درست کرتے رہتے ہیں۔ اسکے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (صحیحین۔ ابوداؤد۔ ترمذی) کے درجہ پر رکھدیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا۔" (ص ۲۶۶-۲۶۷)

یعنی وحی تمام کی تمام قرآن کریم کے اندر محصور ہو چکی ہے اسکے باہر کہیں نہیں پھر جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے آپؑ کی سیرت لکھی جس میں آپؑ کے اقوال و اعمال کو اپنی انفرادی کوشش سے جمع کیا اسی طرح مسلمان ائمۂ تاریخ و روایات نے نبی اکرمؐ کی سیرت اور حضورؐ کے عہد مبارک کی تاریخ مدون کی تاریخ و سیرت کی ان کتابوں کا نام جو اس طرح کی روایات پر مشتمل ہیں۔ کتب احادیث ہیں۔ نہ یہ وحی ہیں۔ نہ وحی (قرآن) کی طرح محفوظ اور اس لئے یقینی نہیں ہیں جس طرح کتب اناجیل یقینی نہیں ہیں (ان امور کی تفصیل کے لئے علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون "علم حدیث" اور جناب پرویز کا مضمون "شخصیت پرستی" ملاحظہ فرمائیے)۔

جناب سندھی کے مضمون کے حاشیہ میں خود شاہ صاحبؒ کی عبارت درج ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:
(عبارت فارسی میں ہے)

"کتاب الٰہی کے لئے دو چیزیں لازم ہیں۔ اول ملکوت کی برکتیں اور ملاء اعلیٰ کی خوشنودگی اور پسندیدگی

ہر اس شخص کے لئے جو کتاب کی تلاوت کرے اور اس کی اشاعت میں کوشش کرے۔ دوسرے طویل زمانوں کے گذر جانے پر بھی اس کتاب کا باقی رہنا اور امت کے لئے اس کے حفظ کرنے کی توفیق حاصل ہونا۔ اگر یہ دو باتیں نہ پائی جائیں تو وہ کتاب کتاب الٰہی نہ ہوگی بلکہ انسانوں میں سے کسی فرد کی تالیف ہوگی جس نے اپنے ارادہ سے علم پیغمبر کو جمع کیا۔ جیسے ہمارے دین میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں" (ص ۲۶۵)

جناب سندھی کے الفاظ میں "اس طرح انبیاء کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانہ میں بھی رائج رہا ہے" (ص ۲۶۵)

لہٰذا کتب احادیث درحقیقت کتب تاریخ ہیں۔ اور کتب تاریخ میں ہر طرح کی روایات درج ہوتی ہیں۔

صحاح ستہ میں غلط روایات کا اختلاط

چنانچہ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں۔ جس طرح باقی کتب میں تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی" (ص ۲۶۶)

آگے چل کر جناب سندھی نے فرمایا ہے کہ یہ پریشانی حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ کے بعد رفع ہوئی۔

ضعیف روایات متواتر کیسے بن جاتی ہیں

جناب سندھی مختلف طبقات کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ان کے سوا بعض ایسے محدثوں نے بھی کتابیں تصنیف کیں جن کی لیاقت علمی بھی مسلم نہیں ہے۔ متاخرین محدثین نے ...... ان غیر معتبر کتابوں کی روائتیں زوائد کے نام سے جمع کر دیں جس سے علم حدیث میں فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ اس ذخیرہ میں کافی سے زیادہ روائتیں ایسی موجود ہیں جن کو دوسرے طبقہ کا مصنف ضعیف قرار دیتا ہے اور ان طبقات الیعنی تیسرے چوتھے اور پانچویں میں پہنچکر ان متاخرین کے نزدیک وہ حدیث متواتر بن جاتی ہے" اس کے بعد آپنے ایک حدیث کی مثال دے کر لکھا ہے "ترمذی نے اس حدیث کی تضعیف کر دی۔ اب مستدرک حاکم کو دیکھئے۔ وہ اس جملہ مضاعفہ کو تیس چالیس سندوں سے روایت کرتا ہے۔ ایک غیر محقق عالم اس کثرت اسانید سے متاثر ہو کر اس کی صحت یا اس کے درجۂ شہرت اور تواتر پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ہم نے حاکم کی ان روایات کی تنقید فتح الباری کی امداد سے شروع کی تو ان میں سے ایک اسناد بھی صحیح نہ نکلی"۔

(ص ۲۷۵)

صحیح بخاری کی ضعیف روایات

اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"تھوڑی تھوڑی غلطیاں ہر مصنف سے ہوتی رہیں۔ حتیٰکہ امام بخاری جو سب سے زیادہ متقن مانے جاتے ہیں ان کی کتاب میں حافظ ابن حجر چالیس کے قریب ایسی احادیث مانتے ہیں جن کی اسانید ضعیف ہیں اور حافظ صاحب کے پاس بھی ان کا کوئی حل نہیں"۔ (ص ۲۷۶) حاشیہ میں ہے "یوں تو حافظ ابن حجر نے صحیح بخاری میں سو کے قریب معلل روائتیں نکالی ہیں۔ پھر ان خدشات کے جوابات بھی بیان کئے ہیں۔ مگر چالیس کے قریب روایات کا ضعف ان کے نزدیک اس درجہ کا ہے کہ باعترافِ حافظ اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا"۔

صحیح اور ضعیف احادیث کا معیار

متشدد فی الحدیث طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ موجودہ مجموعہ احادیث میں حدیثوں کی جو تقسیم ہو چکی ہے وہ اٹل ہے۔ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ جسے صحیح قرار دیا جا چکا ہے وہ صحیح۔ جسے ضعیف کہ دیا گیا ہے وہ ضعیف۔ یعنی اسے تقلیداً ماننا پڑیگا قرآن کریم کی روشنی میں اپنی سمجھ سے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"یہ خرابی جو عام اذہان پر مستولی ہے اس کی تہ میں یہ مرض پنہاں ہے کہ حدیث کے فن کو خصوصاً تصحیح اور تضعیف کو تقلیداً اخذ کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا عالم جو اپنی سمجھ سے صحیح حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہو آج پیدا ہونا متعذر ہو گیا ہے[1]۔ اسماء الرجال میں توثیق و تضعیف کا اختلاف پھر صحیح حدیث کی تعریف میں مختلف آراء۔ طالب العلم میں یکسوئی سے کوئی ملکہ پیدا ہونے نہیں دیتیں۔ آخر مجبور ہو کر۔ فقہا کا جو متوارث مسلک ہے اسی میں راجح و مرجوح کی تمیز پیدا کرنے کے بعد، جو حدیث اس مسلک کے موافق ہو اسے صحیح اور جو مخالف ہو اس کو ضعیف بنانے کی استعداد حاصل ہونے پر طالب العلم اپنا سفر ختم کر دیتا ہے"۔ (ص ۲۷۶) اور اس کے بعد دین کا واحد ٹھیکہ دار بن جاتا ہے جسے چاہے مسلمان سمجھے۔ جسے چاہے کافر قرار دیدے۔

صحیح بخاری کی بعض احادیث

جیسا کہ طلوع اسلام کے صفحات پر کئی مرتبہ آ چکا ہے۔ ہماری کتب احادیث میں ایسی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کرتے ہوئے دل کانپ اٹھتا ہے۔ ان مقالات کی تصریح سے ہم مجتنب رہے ہیں اس لئے کہ ان کا ذکر کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔ دیکھئے! جناب سندھی اس باب میں کیا فرماتے ہیں:۔

---

[1] جو اس کا دعوےٰ کرتے ہیں ان پر کفر کے فتوے عائد کر دئے جاتے ہیں۔

"جس قدر میری توجہ قرآن کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔ میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوا کہ دینی تعلیم اگر عربی مدارس کے طلباء کو دی جائے تو اطمینان بخش ہو اور اگر وہی تعلیم کالج کے طلباء کو دی جائے تو اطمینان پیدا نہ کر سکے۔ اگر ایسا ہو تو وہ تعلیم حقیقی اسلام کی تعلیم نہیں ہوگی اس لئے کہ قرآن ساری دنیا کے لئے نازل ہوا ہے۔ اگر کالج کے طلبہ کو ہم قرآن کی تعلیم اسی طریقے پر (جو عربی مدارس میں کامیاب ثابت ہو) نہیں دے سکتے تو غیر مسلم لوگوں کو ہم کیا پڑھا سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رہا یہ کہ بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں اور میں ایک یورپین نومسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔ اہل علم جو تکمیل کر چکے ہیں۔ یا تکمیل کے قریب ہیں۔ ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہہ دوں گا۔" (صـ۲۸۴-۲۸۵)

علامہ حمید الدین فراہیؒ مرحوم اور حدیث

ہمارے زمانہ میں علامہ حمید الدین فراہیؒ ایک ایسے بزرگ عالم گذرے ہیں جنھیں قرآن کریم سے عشق تھا۔ ان کی تفاسیر کے مختلف ٹکڑے جو دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ کی سعی و کاوش سے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قرآن سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ جناب سندھی نے اس مقام پر جناب فراہیؒ کا ایک واقعہ بھی نقل فرمایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"مولانا حمید الدین مرحوم میرے بہت پرانے دوست تھے۔ قرآن شریف کے تناسق آیات میں ہمارا ذوق متحد تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک ہندوستان میں ان سے ملتا رہا۔ حدیث شریف کے ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا۔ اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں۔ اسی سال وہ بھی حج کے لئے آئے۔ ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں۔ انکار میں بے حد توافق پیدا ہو گیا تھا مگر وہاں بھی حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہو گئی۔ ہم نے سختی سے ان پر انکار کیا اور کہا کہ حدیث کو ضرور ہی ماننا پڑے گا۔ تنگ آکر فرمانے لگے۔ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں میں نے کہا موطا مالک۔ فرمایا ہم اس کو مانتے ہیں۔ میں نے کہا بس آج سے ہمارا نزاع ختم ہے۔ ہم آپ کو صحیح بخاری ماننے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔" (صـ۲۸۷)

جناب حمید الدین فراہیؒ کی کتاب نظام القرآن شائع ہو چکی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب سے حدیث کے متعلق چند اقتباسات پیش کر دئے جائیں تاکہ ان کا مسلک بھی سامنے آجائے۔ ان اقتباسات کے لئے ہم رسالہ البیان کے لئے شکر گذار ہیں۔ جناب فراہیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے ...... حدیث۔ اجماع اور صحفِ اوائل یہ
تینوں ظن و شبہ سے خالی نہیں ...... میں نے بعض روائتیں دیکھی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہیں۔ اور ان
کے نظام کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں ...... ان لوگوں پر تعجب ہے جو آیت کی تاویل تو کر لیتے ہیں لیکن روایت کی
تاویل کا حوصلہ نہیں رکھتے ...... تعجب پر تعجب ہے ان لوگوں پر جو ایسی روایتیں تسلیم کر لیتے ہیں جو نصِ قرآن
پر بھی ہاتھ صاف کر دیتی ہیں۔ مثلاً کذب ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرمؐ کا نطق قرآن بغیر وحی کے ایسی روایتوں کے
تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں جو اگرچہ اصول روایت پر پوری نہ اتریں۔ لیکن درایت کی کسوٹی پر کھری ثابت
ہوں ...... حدیث اور تواتر قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتے ...... ہم اس عقیدہ سے خدا کی پناہ چاہتے
ہیں کہ رسولِ خدا کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔ ایسا خیال یقیناً راویوں کا وہم و خطا ہے ...... میں کہہ چکا
ہوں کہ اختلاف احادیث میں قرآن حاکم ہے۔ یہاں اس قول کی وضاحت کیجاتی ہے میں بعض لوگوں کے
طعن سے ڈرا کرتا تھا۔ لیکن حدیث کے متعلق ان کا مبالغہ یہاں تک پہنچ گیا کہ انھوں نے حدیث کو اس آیت
کے تحت داخل کر لیا (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون) یعنی حدیث کو بھی اللہ نے نازل فرمایا ہے اور وہی
اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے قول کے نتائج پر غور نہیں کیا۔ پس وقت آ گیا کہ میں سچائی
کا علم بلند کر دوں اور قطعاً پرواہ نہ کروں۔ چاہے میرا سر کاٹ ڈالا جائے اور میرا بند بند الگ کر دیا جائے
...... اکثر اہل حدیث کے دلوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا۔ اس میں
شک کی گنجائش نہیں پس ہم بعض قابل اعتراض مقامات لکھتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو دب
ٹھہرانے کی شناعت فرمائی ہے۔ پس ہم ان کے غیر معقول فکر و فہم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ...
... پس ان متضاد روایات میں اطمینان کی کوئی صورت نہیں۔ ان سے اور زیادہ قلق و تشنگی کے سوا کوئی
امید نہ رکھو طریق واضح اتباع لغت[1] اور تدبر فی القرآن ہے۔ اور بس"

قرآن اور فقہ کی کتاب

جناب سندھی فرماتے ہیں:۔
"قرآن عظیم ہماری دانست میں اپنے موضوع کی مستقل کتاب ہے۔ گذشتہ

---

[1] لغت کو بھی قرآن کے تابع ہونا چاہیئے۔

فصول میں ہم نے اس کی توضیح کرنے کی سعی کی ہے۔ مگر آیاتِ احکام پر عمل کرنے کے لئے ہمیں دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کا طرزِ عمل معلوم ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایک فقہ کی کتاب درکار ہے جس میں تصریح ہو کہ رسول اللہ صلعم یوں نماز ادا کرتے تھے مسلمانوں سے زکوٰۃ اس طرح وصول کرتے تھے۔ بیع و شریٰ کے معاملات اس طرح طے ہوتے تھے غرض جمیع آیاتِ احکام کی تفصیل رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے وفاقی دور (یعنی شہادت عثمانؓ تک) سے معلوم ہونی چاہیئے۔ اور یہ چیز موطا میں ملتی ہے۔...... امام ولی اللہ قرآن عظیم کے معانی کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں تقسیم کر چکے ہیں اور ان کے نزدیک ہر ایک باب ان میں سے اپنے افادے میں مستقل ہے۔ نہ تو کسی پہلی کتاب کا محتاج ہے اور نہ کسی بعد کے علم و عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ فنِ احکام علمی طور پر آنحضرت صلعم کا اسوہ سمجھنے کا محتاج ہے۔ خیر القرون میں جس طرح قرآن شریف پر عمل کیا گیا وہ اہلِ مدینہ کے یہاں محفوظ تھا اور موطا اس کا ایک نصاب ہے اس لئے قرآن پڑھنے کے بعد موطا کی ضرورت بہر حال باقی رہے گی۔ شاہ صاحبؒ کی تقسیم میں احکام کے سوا جو فنون ہیں ان میں قرآن حکیم کسی فن (مثلاً مغازی و تفسیر اور فتن و ملاحم) کا محتاج نہیں ہے۔ اب ایک ایسے امام کے لئے جو اسلام کو قرآن شریف میں مکمل پاتا ہو موطا جیسی فقہ کی کتاب کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔" (صفحہ ۲-۲۸)

یعنی قرآن کریم کے بعد ضرورت صرف اس قدر باقی رہ جاتی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ جن احکام کا ذکر قرآن میں موجود ہے ان پر رسول اللہ صلعم نے عمل کس طرح سے کیا۔ مثلاً قرآن کریم میں اقامت صلوٰۃ (نماز) کا حکم موجود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ حضورؐ نے اس حکم پر عمل کس طرح کیا۔ چونکہ احکام پر عمل محسوس شکل میں ہوتا ہے اور وہ محسوس شکلیں امت میں متواتر نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہیں اس لئے عمل متواتر قرآن کے احکام کی تفصیل ہے۔ اور ضروری۔ موطا امام مالکؒ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں پانچ چھ سو سے زیادہ احادیث نہیں اور ان کا بھی بیشتر حصہ احکامات پر مشتمل ہے۔ اس لئے کتب احادیث میں فی الجملہ زیادہ صحیح ہے۔ قرآنی احکام کی عملی تفصیل کے لئے اگر اس کی طرف رجوع کر لیا جائے تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ یہ بھی جیسا کہ جناب سندھی نے فرمایا ہے۔ فقہ (بائیلاز) کی کتاب ہوگی۔ ان بائیلاز میں سے جو ایسے ہیں جن پر زمانہ کا تغیر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اسی شکل میں قائم رکھے جائیں گے (جیسے نماز روزہ وغیرہ) لیکن جو مقتضیاتِ زمانہ سے متاثر ہو جاتے ہیں ان کی جگہ ہر زمانہ میں دوسرے بائیلاز مرتب کئے جائیں گے۔ اس لئے کہ جناب سندھی کے الفاظ ہیں۔

"جب اساسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ ...... یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوئی ...... اصل قانون اساسی متعین ہوتا ہے۔ بائیلاز اس وقت اور تھے اس وقت اور ہونگے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے" (۲۶۴)

مرکزیت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بائیلاز میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا حق کسے حاصل ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس کا حق حکومت الٰہیہ کی مرکزی جماعت کو ہوگا۔ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"اس کے بعد میرے دماغ پر یہ اثر پیدا ہوا کہ قرآن عظیم دنیا کی تمام اقوام میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام ہے ...... اگر قرآن عظیم کی تعلیم کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام مان لیا جائے تو اس کے لئے تین چیزوں کی تعین ضروری ہے (الف) اس کا آئیڈیا (ب) اس کا پروگرام (ج) اس پروگرام کو چلانے والی سنٹرل کمیٹی۔ کوئی انقلابی تحریک، پارٹی پالٹیکس کے سوا کامیاب نہیں ہوتی۔ اور ہر پارٹی پالٹیکس میں ان تین چیزوں کی تعین ضروری ہے۔

(۱) میں نے قرآن عظیم میں غور کر کے اس کا آئیڈیا اس آیت کو مقرر کیا هُوَ الَّذِی اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِینِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّینِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ [۱]

(۲) پروگرام کے لئے پہلے حزب اللہ کی تعین و تحدید ضروری ہے۔ حزب اللہ اس پارٹی کا نام ہے جو قرآن عظیم کے انٹرنیشنل پروگرام کو کامیاب بنانا اپنا مقصد حیات قرار دیتی ہے۔ حزب اللہ کی ضروریات پر قرآن عظیم کی مختلف صورتوں میں کافی ہدایتیں دی گئی ہیں جہاں جہاں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وغیرہ سے مومنین کو خطاب کیا گیا کہ وہ کفار اور منافقین کے راستے پر نہ چلیں بلکہ فلاں فلاں حکم کی اس اس طرح پابندی کریں۔ ان تمام مواقع کو حزب اللہ کا پروگرام سمجھنا چاہیئے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے پہلے مخاطب حزب اللہ کے افراد ہی ہوتے ہیں

---

[۱] اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حقہ کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ دین تمام ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب آجائے۔ خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

اس میں مرد و عورت۔ عرب و عجم سب شامل ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ السابقون الاولون من المھاجرین والانصار اور ان کے بعد (والذین اتبعوھم باحسان) قیامت تک کی جمیع اقوام مسلمہ کو شامل ہے۔ اس طرح یہ پروگرام قیامت تک جاری رہے گا۔" (صفحہ ۲۹۴)

تصریحات بالا پر غور کیجئے، اور پھر یہ دیکھئے کہ طلوع اسلام گذشتہ چار برس سے کس مسلک کی طرف دعوت دیتا چلا آرہا ہے؟ جو کچھ گذشتہ اوراق میں درج کیا گیا ہے اس کا ملخص یہی ہے کہ۔

(۱) قرآن کریم مکمل کتاب ہے اور اپنی تفسیر میں کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں (۲) دین قرآن کریم کے اندر محصور ہے۔ (۳) احکام قرآنی (مثل نماز۔ روزہ وغیرہ) کی عملی تشکیل نبی اکرمؐ نے متعین فرمائی جس کی پابندی امت کے لئے لازمی ہے۔ یہ عمل محسوس متواتر ہم تک پہنچا ہے۔ (۴) نبی اکرمؐ کا ایک فریضہ تبلیغ رسالت (یعنی انسانوں تک قرآن کا پہنچانا) تھا اور دوسرا فریضہ حکومت الٰہیہ کا قیام (۵) حکومت الٰہیہ میں معاملات کے فیصلے قرآن کے قانون اساسی کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ قانون اساسی متعین اور غیر متبدل ہے۔ لیکن اسکی روشنی میں مرتب شدہ فروعی قوانین (بائیلاز) زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ (۶) فروعی قوانین کی ترتیب و تدوین حکومت الٰہیہ کے ارباب حل و عقد کی مرکزی جماعت کا فریضہ ہے جسے قیامت تک جاری رہنا چاہیئے تھا۔

(۷) خلافت راشدہ کے بعد یہ نظام برہم ہو گیا اور دین میں انفرادیت اور ملوکیت آگئی۔ (۸) اب پھر دین کو اپنی اصلی شکل میں قائم کرنے کے لئے حکومت الٰہیہ کے قیام کی ضرورت ہے جس میں قانون اساسی قرآن کریم ہوگا۔ اور تمہیدی قوانین (بائیلاز) قرآن کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق مرتب کئے جائیں گے اس میں قرن اولےٰ کی نقد (بائیلاز) سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے اس طرح امت کے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔

(۹) کتب احادیث۔ تاریخ کی ان کتابوں کا نام ہے جن میں عہد نبویؐ اور عہد صحابہؓ کے احوال و کوائف درج ہیں۔ یہ انسانوں کی انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے اس لئے ظن و تخمین اور شک و شبہ سے بلند نہیں ہے نہ ہی تنقید سے بالا۔ جس طرح کتب اناجیل وغیرہ احادیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ جو احادیث اس معیار پر پوری اتریں۔ ان سے ہم اپنے زمانہ کے بائیلاز مرتب کرنے میں مدد لے سکتے ہیں۔ (۱۰) نبی اکرمؐ کا منصب رسالت پیغمبری حضورؐ کی ذات گرامی تک ختم ہوگیا۔ اب کوئی نبیؐ اور رسول نہیں آسکتا۔ لیکن منصب امامت (حکومت الٰہیہ کا قیام و بقا)[صلہ] خلافت راشدہ میں منتقل ہوگیا اگر وہ نظام قائم رہتا تو یہ منصب آج تک جاری رہتا۔ اس منصب کے احیاء میں ہی اصل دین کے احیاء کا راز مضمر ہے۔

اِسی سلسلہ کی دوسری کڑیاں

یوں تو مجلہ طلوعِ اسلام کی پوری جلدیں اِس قسم کے مضامین کو اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن ذیل کے مضامین اس سلسلہ میں خصوصیت سے قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

(۱) فہم قرآن	از علامہ اسلم جیراجپوری	مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۳۸ء	
(۲) اسلامی نظام	"	"	جولائی ۱۹۳۸ء
(۳) مرکزیت	از جناب پرویز	"	نومبر ۱۹۳۸ء
(۴) خدا کی بادشاہت	"	پمفلٹ۔	قیمت ۲؍
(۵) تمسک بالکتاب	"	مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۴۰ء	
(۶) شخصیت پرستی	"	پمفلٹ۔	قیمت ۲؍
(۷) علم حدیث	از علامہ جیراجپوری	پمفلٹ۔	قیمت ۲؍

طلوعِ اسلام کے مذکورہ بالا پرچے ۴؍ فی پرچہ کے حساب سے مل سکیں گے
اِن مضامین کے علاوہ جناب پرویز کی معرکۃ الآرا تالیف معارف القرآن بھی ملاحظہ فرمائیے جس کا اجمالی تعارف دوسرے صفحہ پر ہے۔

ناظم

ادارۂ طلوعِ اسلام

دورِ حاضرہ کی عظیم الشّان کتاب

"معارف القرآن"

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز مدظلہٗ)

یعنی حقائقِ قرآنی کا دائرۃ المعارف۔ جو اس اصول پر مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ قرآن کریم سے متعلق کوئی مسئلہ آپ کے ذہن میں آئے۔ پوری کی پوری قرآنی تعلیم۔ ایک دلکش۔ مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔

جلد اوّل

شائع ہو چکی ہے۔ بڑی تقطیع ۲۲×۲۹/۸ کے ۶۷۵ صفحات پر مشتمل۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت۔ جلد اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت

بلا جلد — پانچ روپیہ — محصول ڈاک ۱۲؍

مجلد — ساڑھے چھ روپیہ — محصول ڈاک ایک روپیہ

کتاب کا مقدمہ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ کے تبحرِ علمی کا آئینہ دار ہے۔ جس میں علمِ تفسیر پر بالخصوص محققانہ بحث کی گئی ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام قرول باغ۔ دہلی